© rasailojaraid.com

شاہد حسین رزاقی

ہندوستانی مسلمانوں کی پہلی سیاسی تنظیم

سنٹرل نیشنل محمڈن اسوسی ایشن

انیسویں صدی کے آخر ربع میں اسلامی ہند کے سب سے بڑے سیاسی رہنما سید امیر علی تھے سلطنت مغلیہ کے زوال اور انگریزی حکومت کے قیام و استحکام کی وجہ سے مسلمان بے شمار مصائب و مشکلات میں مبتلا ہو گئے تھے۔ ان کا سیاسی اقتدار ختم ہو گیا تھا معاشرتی وقار گر گیا تھا۔ اقتصادی حالت روز بروز خراب تر ہوتی جا رہی تھی۔ زوال و انتشار کا دور دورہ تھا اور حکومت و سیاست میں آئندہ جن تبدیلیوں کی توقع کی جا رہی تھی ان کی وجہ سے مسلمان قوم کا مستقبل بہت تاریک نظر آ رہا تھا۔ امیر علی کی دور اندیشی و دور بینی اور سیاسی فہم و فراست سے یہ حقیقت پوشیدہ نہ تھی کہ مسلمانوں کی موجودہ مشکلات کو حل کرنے اور آیندہ حالات کو سازگار بنانے کے لیے ان کو منظم و متحد کرنا نہایت ضروری ہے۔ تمام حالات و اسباب کا غائر مطالعہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ہندوستان میں عنقریب سیاسی جدوجہد کا دور شروع ہو جائے گا۔ اہل ہند کو رفتہ رفتہ سیاسی حقوق دیئے جائیں گے اور جمہوری اصولوں پر مبنی حکومتی ادارے قائم کیے جائیں گے اور ان حقوق اور اداروں سے وہی قومیں فائدہ اٹھا سکیں گی جو سیاسی اعتبار سے باشعور اور منظم و متحد ہوں گی۔

اسوسی ایشن کا قیام

آخر کار امیر علی نے مسلمانوں کے حقوق و مفادات کے تحفظ کے لیے ایک ایسی سیاسی تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا جو قوم کی نمائندہ ہو جس کی شاخیں سارے ملک میں قائم ہوں، جو مسلمانوں کو سیاسی تربیت دے سکے اور حکومت کے سامنے ان کے مطالبات موثر طور پر پیش کرے۔ اس دور میں سرسید احمد خاں ملک کے مشہور ترین رہنما تھے اور امیر علی نے ان سے امداد و تعاون کی خواہش کی مگر سرسید نے انکار کر دیا کیونکہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کا نظریہ یہ تھا کہ اگر مسلمانوں نے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیا تو انگریز بدگمان ہو جائیں گے اور ان کی ناراضگی مسلمانوں کے لیے تباہ کن ثابت ہوگی لیکن اس نظریہ کے حامی لوگوں کی مخالفت کے باوجود امیر علی اپنے ارادے پر قائم رہے اور فروری ۱۸۷۷ء میں نیشنل محمڈن اسوسی ایشن کے نام سے ایک جماعت کلکتہ میں قائم کردی اور جب ملک کے مختلف حصوں میں اس کی شاخیں قائم ہوگئیں تو اس کا نام سنٹرل نیشنل محمڈن اسوسی ایشن رکھا گیا۔ مسلمانوں کی یہ تنظیم ہندوستان میں پہلی ملک گیر سیاسی تنظیم تھی جو انڈین نیشنل کانگریس کے قیام سے بھی آٹھ نو سال پہلے قائم ہوگئی تھی اور جس نے اس ملک کی سیاسی جد وجہد میں اہم کردار ادا کیا۔

اغراض ومقاصد

نیشنل محمڈن اسوسی ایشن کن حالات میں قائم کی گئی تھی اور اس کے مقاصد کیا تھے۔ اس کی وضاحت اس کے اغراض ومقاصد میں بھی کی گئی تھی جو کلکتہ میں شائع ہوئے تھے۔ اس میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ "ہندوستانی مسلمانوں کی موجودہ پستی وپس ماندگی کے اسباب کچھ تو داخلی ہیں اور کچھ خارجی۔ مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا ہو گیا ہے۔ سربرآوردہ خاندانوں کو زوال آگیا ہے اور مسلمان قوم کے تمام طبقے تباہی سے دوچار ہیں لیکن کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے جو حکومت کے سامنے ہندوستانی مسلمانوں کے نقطہ نظر کو پورے اعتماد کے ساتھ اور صحیح طور پر پیش کر سکے اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی اثر اور قوت کے اعتبار سے ہندوستانی مسلمان بمقابلہ دوسری قوموں کے خسارے میں ہیں۔ اب تک کوئی ایسی سیاسی تنظیم نہ تھی جو خیر اندیشی اور آزادی کے ساتھ اس ملک کے مسلمانوں کی تمنا و توقعات اور ان کے جائز مطالبات وضروریات حکومت کے سامنے پیش کر سکتی۔ حالانکہ ایسے تمام مسائل ہیں جن کا تعلق ہندوستان کی فلاح و بہبود سے ہو مسلمان اپنی تعداد و تجانس کی بنا پر ایک نہایت اہم عنصر ہیں۔ یہاں متفرق طور پر مسلمانوں کی جو انجمنیں قائم تھیں وہ زیادہ تر ادبی اور علمی تھیں اور ان کا مقصد مسلمانوں میں مغربی علوم کی ترویج کرنا تھا اور مسلمانوں کا کوئی نمائندہ سیاسی ادارہ نہ ہونے کی وجہ سے حکومت کسی علاقہ کے مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے مسائل کے بارے میں کبھی کبھی بدرجۂ مجبوری انہی انجمنوں سے مشورہ کر لیتی تھی۔ مگر اس طرح جو مشورہ حاصل کیا جاتا تھا وہ زمانہ کے تقاضوں سے باخبر اہل فکر رہنماؤں کے نظریات کی ترجمانی مشکل کر سکتا تھا۔ مسلمان قوم فرقوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی تھی اس لیے عام مسائل کو حل کرنے اور معاشرہ کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اصلاح و ترقی کے لیے اجتماعی اقدام کرنے کے تمام امکانات بھی ختم ہو گئے تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کو درپیش مشکلات کو ختم کرنے اور ان کے قومی مفادات کی حمایت و حفاظت کرنے کے لیے نیشنل محمڈن اسوسی ایشن قائم کی گئی۔

تنظیم کے جو اغراض و مقاصد بیان کیے گئے ان میں زیادہ اہم یہ ہیں:

(۱) اس اسوسی ایشن کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی فلاح و ترقی کے لیے تمام جائز اور آئینی طریقے اختیار کیے جائیں۔ تاج برطانیہ سے وفاداری اس کا ایک بنیادی اصول ہے اور اس کا مقصد و مسلک یہ ہے کہ اپنے ماضی کی شاندار روایات سے اکتسابِ فیض کرتے ہوئے عصرِ حاضر کے ترقی پذیر رجحانات اور مغربی ثقافت کے پسندیدہ عناصر سے ہم آہنگی پیدا کی جائے۔ اس کا نصب العین ہندوستانی مسلمانوں کی حیاتِ نو ہے اور اس مقصد کے لیے یہ اسوسی ایشن مسلمانوں کے اخلاقی احیا اور حکومت سے ان کے جائز اور معقول مطالبات تسلیم کرانے کے لیے مسلسل جدوجہد کرتی رہے گی۔

۲۔ تاہم یہ امر بھی اسوسی ایشن کے پیشِ نظر ہے کہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کا ہندوستان کی دوسری قوموں کی فلاح و بہبود سے گہرا تعلق ہے۔ چنانچہ مجموعی طور پر اس ملک کے تمام باشندوں کے عام مفادات کی حمایت بھی اس کے دائرۂ عمل سے خارج نہیں ہے۔

۳۔ توقع ہے کہ اسوسی ایشن مسلمانوں کے مقاصد و مفاد کے لیے کام کرنے کے ساتھ ساتھ غیر مسلم ہم وطنوں کے مفاد کی حمایت و حفاظت بھی کر سکے گی۔ اور اس بات کی بھی توقع ہے کہ یہ انجمن ملکہ معظمہ کی رعایا کی ایک قابلِ لحاظ تعداد کے مطالبات حکومت کے سامنے پیش کر کے اور ان کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کر کے ہندوستان میں مضبوط بنیادوں پر اچھی حکومت کے استحکام میں بہت مفید و معاون ثابت ہو گی۔

امیر علی کی سرگرمیاں

نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کے مقاصد کی اشاعت اور مسلمان قوم کو متحد و منظم کرنے کی غرض سے امیر علی نے ہندوستان کے طول و عرض میں وسیع دورے کیے اور عام جلسوں اور دوسرے اجتماعوں میں تقریریں کر کے مسلمانوں کو سیاسی طور پر منظم کرنے کی ضرورت و اہمیت واضح کی اور اس بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر زور دیا کہ مسلمان جدید علوم و فنون حاصل کریں۔ اپنی اقتصادی حالت کو بہتر بنانے کے لیے پوری جدوجہد کریں۔ معاشرتی برائیاں دور کرنے پر متوجہ ہوں۔ زوال و انتشار کو ختم کر کے منظم و متحد ہو جائیں اور زمانے کے تقاضے پورے کر کے میدانِ ترقی میں گامزن ہوں۔

نیشنل محمڈن اسوسی ایشن کا مرکزی دفتر کلکتہ میں تھا اور اس کی شاخیں ہندوستان کے مختلف حصوں میں قائم ہونے لگیں۔ امیر علی اپنے دورے میں اسوسی ایشن کی شاخیں بھی قائم کر رہے تھے۔ یہ جماعت مسلمانوں میں بہت مقبول ہونے لگی اور کچھ ہی دنوں میں اس کی ۳۴ شاخیں قائم ہو گئیں۔ آگے چل کر یہ تعداد ۵۴ ہو گئی اور یہ ملک گیر تنظیم بن گئی۔ سندھ اور پنجاب سے لے کر بنگال تک اور شمال مغربی صوبوں سے لے کر مدراس تک اسوسی ایشن کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اسوسی ایشن کی سہ سالہ رپورٹ بابت ۸۸-۱۸۸۵ء میں مندرجہ ذیل شاخوں کے نام درج ہیں:۔

کراچی۔ شہداد پور۔ شکارپور۔ لاڑکانہ۔ سکھر۔ لاہور۔ امرت سر۔ گجرات۔ انبالہ۔ لدھیانہ۔ دہلی۔ حصار۔ بریلی۔ بدایون۔ ہردوئی۔ لکھنؤ۔ موہان۔ الہ آباد۔ غازی پور۔ اجمیر۔ سوات۔ ڈنڈیگل۔ بنگلور۔ تمکور۔ وزیگا پٹم۔ وجیانگرم۔ سہسرام۔ آرہ۔ دیناپور۔ گیا۔ پٹنہ۔ چھپرا۔ سہوان۔ مظفرپور۔ موتی ہاری۔ بھاگل پور۔ ہگلی۔ جہان آباد۔ پنڈوا۔ رنگ پور۔ مدناپور۔ بوگرہ۔ راج شاہی۔ نواکھلی۔ میمن سنگھ۔ کومیلا۔ شیلانگ۔ چٹاگانگ۔ ڈھاکہ۔ برہما باڑیہ اور کٹک۔

وائسرائے کی خدمت میں اسوسی ایشن کی عرضداشت

فروری ۱۸۸۲ء میں امیر علی نے مرکزی اسوسی ایشن کی طرف سے لارڈ رپن وائسرائے ہند کی خدمت میں عرضداشت پیش کی جس میں مسلمانوں کی تاریخی و سیاسی اہمیت اور ان کی موجودہ زبوں حالی پر بہت تفصیل سے روشنی ڈالی گئی تھی اور ان کو تباہی سے بچانے اور حالات کو بہتر بنانے کے لیے ان کے سیاسی و معاشی مفادات کا تحفظ کرنے کی استدعا کی گئی تھی۔ عرضداشت میں اس یقین کا اظہار کیا گیا تھا کہ لارڈ رپن ہندوستانی مسلمانوں کے حالات کو بہتر بنانے پر پوری توجہ کریں گے کیونکہ وہ ہندوستان کے تمام باشندوں کی فلاح و بہبود اور ان کے مفادات کے تحفظ سے انتہائی گہری دلچسپی لیتے اور اس بات کا پورا لحاظ رکھتے ہیں کہ ہندوستانیوں کے تمام طبقوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کیا جائے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

علاوہ ازیں وہ اس سے بخوبی واقف ہیں کہ ہندوستانی مسلمان جو عہدِ ماضی میں نہایت خوش حال تھے، اب غربت و افلاس سے دوچار ہیں۔

عرض داشت پیش کرنے کا مقصد یہ بیان کیا گیا تھا کہ "ہندوستان میں اکثر مسلمان خاندانوں کی تباہی اور پستی کے جو اسباب تھے وہ بدقسمتی سے اب تک برقرار ہیں اور اس توقع پر کہ جب حکومت کو مسلمانوں کی غربت و افلاس کے بارے میں صحیح حالات سے آگاہ کیا جائے گا تو ان کی موجودہ زبوں حالی کو دُور کرنے اور ان کے حالات کو بہتر بنانے کے لیے موثر تدبیریں اختیار کی جائیں گی، یہ عرضداشت پیش کی جارہی ہے" حکومت سے ہمدردانہ توجہ کرنے اور مسلمانوں کے حالات کو بہتر بنانے کی استدعا کرتے ہوئے عرضداشت میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان جس پستی اور زبوں حالی میں مبتلا ہیں ان کو روکنے کے لیے وہ خود موثر اصلاحی تدبیریں اختیار کرنے سے قاصر ہیں۔ ان کی موجودہ پستی اور زبوں حالی ہر طرح سے دردمندانہ توجہ کی مستحق ہے۔ انگریزی عہدِ حکومت میں ہندوستان کی ہر ایک قوم کو خوش حالی اور ترقی نصیب ہوئی ہے لیکن مسلمان مسلسل زوال و افلاس کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ ان کی حالت روز بروز خراب تر ہوتی جارہی ہے اور ان کی بہتری کے لیے مناسب عملی تدبیریں اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔

مسلمانوں کا موقف

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل و حالات اور مطالبات کے متعلق عرضداشت میں یہ وضاحت سے بیان کیا گیا کہ بعض اوقات یہ کہا جاتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی مفلوک الحالی کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے تعلیم حاصل کرنے کی ان سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا اور اس سے غفلت برتی جو حکومت نے ان کے لیے فراہم کی ہیں۔ اس بارے میں مسلمانوں کے مُوقف کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے مندرجہ ذیل حالات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

انگریزوں نے جب مغل حکمرانوں سے مشرقی صوبوں کا پٹہ حاصل کیا اور ان پر قابض ہوگئے۔ تو حالات میں بہت کچھ تبدیلی ہوگئی لیکن اس کے باوجود دولت اور طاقت مسلمانوں ہی کے ہاتھ میں رہی۔ ۱۲؍اگست ۱۷۶۵ء کو ایک معاہدے کے مطابق شاہ عالم نے بنگال، بہار اور اڑیسہ میں محاصل وصول کرنے کا اختیار ایسٹ انڈیا کمپنی کو دے دیا تھا لیکن اس معاہدے سے مسلمانوں کے سیاسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

موقف میں کوئی فرق نہیں آیا اور ایک مدت دراز تک مسلمان اپنے مرتبے پر قائم رہے۔ لارڈ کارنوالس کے زمانے تک ملک کا نظم و نسق مسلمان حکمرانوں کے قائم کردہ نظام کے مطابق ہی چلتا رہا۔

زوال وافلاس کا آغاز

کارنوالس کو ہندوستان خاص طور پر اس لیے بھیجا گیا تھا کہ کمپنی کے ملازمین کی بدعنوانیوں کی وجہ سے نظامِ حکومت میں جو خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں وہ دُور کی جائیں۔ لیکن کارنوالس نے انتظامی اور عدالتی شعبوں میں ایسی متعدد تبدیلیاں کیں جن سے آگے چل کر مسلمانوں کی مادّی خوشحالی پر بہت بُرا اثر پڑا۔

کارنوالس کی اختیار کردہ تدبیروں کا مسلمانوں کی سیاسی حیثیت پر فوری کوئی اثر نہیں ہوا اور دوامی بندوبست اور جدید عدالتی نظام قائم ہونے کی وجہ سے محاصل وصول کرنے والے ہندو افسران کو جو اختیارات دیئے گئے تھے ان کے باوجود مسلمانوں کی امتیازی حیثیت برقرار رہی۔ چنانچہ اس زمانے کی سول لسٹیں دیکھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس وقت بھی سرکاری ملازمتوں میں مسلمان ۷۵ فی صد تھے۔ مسلمانوں کے زوال اور افلاس کی ابتدا دراصل ولیم بنٹنک کے عہد میں ہوئی۔

بنٹنک کی پالیسی کے جو نتائج برآمد ہوئے ان کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے بعض امور کو واضح کردینا ضروری ہے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے آغاز سے لے کر ۱۸۳۷ء تک فارسی سرکاری زبان تھی اور یہ صورتِ حال اس وقت بھی قائم رہی جب انگریزوں نے مسلمان بادشاہوں سے سیاسی اختیارات حاصل کرلیے۔ ہندوستان فتح کرنے والے مسلمانوں میں مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگ شامل تھے جو مختلف زبانیں بولتے تھے لیکن فارسی سرکاری زبان قرار دی گئی تھی اور نہ صرف مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں بلکہ ۱۸۳۷ء تک انگریزوں کے عہدِ حکومت میں بھی سرکاری زبان فارسی ہی رہی۔

اردو زبان اور حکومت کی لسانی پالیسی

مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی میل جول سے ایک نئی ملی جلی زبان پیدا ہوئی جو اُردو کہلاتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ اردو زبان سارے ہندوستان کے مسلمانوں کی زبان ہے۔ پنجاب سے لے کر بنگال تک اُردو بولی جاتی ہے اور یہاں نہ صرف مسلمانوں بلکہ اکثر ہندوؤں کی بھی یہی زبان ہے۔ ۱۸۳۷ء میں یہ حکم جاری کیا گیا کہ آئندہ سے دفتری کام انگریزی میں یا علاقائی زبانوں میں ہوا کرے۔ اب تک تو ہر صوبہ میں فارسی رائج تھی۔ مگر اس حکم کے بعد بنگال، مدراس، بمبئی اور گجرات میں بنگالی، تامل، تلگو، مرہٹی، اور گجراتی نافذ کر دی گئیں جن کے رسم الخط بھی فارسی سے مختلف تھے۔ بہار، شمال مغربی صوبوں اور پنجاب میں جہاں صدیوں سے لوگ اردو بولتے تھے اور یہ زبان فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی۔ اس حکم کے مطابق عمل درآمد میں ناکامی ہوئی کیونکہ انگریزی حکومت کی کوشش یہ تھی کہ ناگری رسم الخط میں لکھی جانے والی ہندی کیتھی کو ان صوبوں میں دفتری زبان بنایا جائے۔ چنانچہ اس تجویز سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوؤں میں بھی بے چینی پھیل گئی اور یہ کوشش ناکام ہوئی۔ آخر کار بہار، شمال مغربی صوبوں اور پنجاب میں فارسی کی جگہ اُردو کو دی گئی جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے لیکن جن صوبوں میں فارسی زبان اور رسم الخط کو خارج کر کے علاقائی زبانیں نافذ کی گئیں وہاں مسلمان ملازموں کو شدید مشکلات پیش آئیں اور ان کی بڑی تعداد بے روزگار ہو گئی۔ سرکاری ملازمت مسلمانوں کا اہم ذریعہ معاش تھی اور اس سے محرومی و بے روزگاری نے ان کو مفلس بنا دیا۔

سرکاری عہدے اور مسلمان

مسلمانوں کے درمیانی طبقہ کی مفلوک الحالی درحقیقت اسی دور میں شروع ہوئی۔ انگریزی تعلیم یافتہ ہندو نوجوان زیادہ تر مشنری اداروں میں تربیت پاتے تھے اور مسلمان قدرتی طور پر ان اداروں سے دور رہے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام سرکاری دفتروں میں ہندو بھر گئے، اور ان کے دروازے مسلمانوں پر یکسر بند ہو گئے۔ کچھ غیر اہم ملازمتوں پر مسلمان برقرار رہے۔ لیکن سال بہ سال یہاں بھی ان کی تعداد کم ہوتی گئی اور آخر کار یہ نوبت آئی کہ بقول ڈاکٹر ہنٹر اب شاید ہی کوئی سرکاری دفتر ہوگا جہاں مسلمان چوکیدار، ہرکارے یا چپراسی سے زیادہ درجہ کی نوکری حاصل کر سکتے ہیں۔

حکومت نے نظم و نسق میں انقلابی تبدیلی کر دی اور سرکاری ملازمتوں کے خواہش مندوں کے لیے انگریزی زبان جاننا لازمی قرار دیا گیا لیکن اس نے انگریزی تعلیم کو لازمی کر دینے کا کوئی حکم نہیں دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ور ۱۸۶۴ء تک مسلمان یہی سمجھتے رہے کہ خود ان کی ادبیاتِ عالیہ پر عبور حاصل کرنا ہی سرکاری ملازمت کے لیے ناگزیر شرط ہے۔ حکومت کا یہ حکم کہ منصفی اور وکالت کے امیدوار متعلقہ امتحان اردو یا انگریزی میں پاس کریں ۱۸۶۴ء تک نافذ رہا۔ اور پھر سال دو سال کے بعد ہی اچانک تبدیلی کر دی گئی اور یہ حکم جاری ہوا کہ بالائی گریڈ کی منصفی اور وکالت کا امتحان صرف انگریزی میں ہوا کرے۔ اس کے بعد سے وقتاً فوقتاً جو تبدیلیاں کی جاتی رہیں وہ مسلمانوں کے لیے نقصان رساں تھیں۔ چنانچہ قبل اس کے کہ مسلمان انگریزی سیکھنے کی ضرورت واہمیت سے آگاہ ہوں، سرکاری ملازمتوں کے دروازے ان کے لیے بند ہو گئے۔

اس بیان کی تائید میں مندرجہ ذیل حقائق پیش کیے گئے:

۱۸۷۱ء میں گزٹیڈ ملازمتوں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب ایک اور سات کا تھا۔ یہ تناسب ۱۸۸۰ء میں کم ہو کے ایک اور دس ہو گیا۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے اس کا صحیح اندازہ ان محکموں پر نظر ڈالنے سے ہو سکتا ہے جہاں کے حالات سے لوگ مقابلتہً کم باخبر ہوتے ہیں۔ محکمہ خارجہ کے ۵۴ افسروں میں صرف ۲ مسلمان ہیں۔ محکمہ داخلہ کے ۴۳ افسروں میں صرف ایک مسلمان ہے۔ محکمہ مالیات اور ریونیو کے ۷۵ افسروں میں کوئی بھی مسلمان نہیں۔ کنٹرولر جنرل کے دفتر میں ۶۳ افسروں میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ سکریٹری حکومت بنگال کے دفتر میں ۹۰ اعلیٰ افسروں میں کوئی مسلمان نہیں۔ عدالت و سیاسیات اور تعزیرات کے محکموں میں ۸۲ افسروں میں ایک بھی مسلمان نہیں۔ اکاؤنٹنٹ جنرل بنگال کے دفتر میں ۱۸۱ افسر ہیں جن میں کوئی مسلمان نہیں۔ بورڈ آف ریونیو کے ۱۱۳ مددگاروں میں صرف ایک مسلمان ہے۔ بنگال کے انسپکٹر جنرل آف رجسٹریشن کے دفتر میں صرف ایک مسلمان ملازم ہے۔ محکمہ کسٹم میں ۱۳۰ بڑے عہدہ دار اور مددگار ہیں لیکن ان میں ایک بھی مسلمان نہیں اسی طرح پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ کلکتہ سکریٹریٹ، ڈائرکٹر جنرل پوسٹ آفس کے دفتر اور پبلک ورکس ڈیپارٹمنٹ میں بھی کوئی مسلمان ملازم نہیں ہے۔ محکمہ ڈاک کے ۲۰۲۵ افسروں میں صرف ۱۰۰ مسلمان ہیں۔ محکمہ تعلیم کے ۲۷۰۵ افسروں میں مسلمان صرف ۳۸ ہیں۔ ہائی کورٹ میں ۳۵۹ افسروں میں ۹۲ مسلمان ہیں۔ اور کلکتہ کی عدالت کے ۲۷ افسروں میں بھی مسلمان صرف ایک ہے۔ یہ اعداد و شمار بنگال سے متعلق ہیں جہاں کے زیریں صوبوں میں ایک تہائی آبادی مسلمان ہے۔ اور مشرقی اضلاع میں مسلمانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی نہ صرف اکثریت ہے بلکہ بعض علاقوں میں تو ان کی آبادی دو تہائی سے بھی زیادہ ہے۔

معروضہ پیش کرنے والوں نے اپنی اس عرضداشت کے ساتھ چند گوشوارے بھی منسلک کیے تھے جن میں شہر کلکتہ، مختلف اضلاع اور مختلف محکموں میں عیسائی، ہندو اور مسلمان ملازموں کی تعداد درج تھی اور ان میں ایک فہرست گزیٹڈ عہدہ داروں کی بھی تھی جس میں یہ بتلایا گیا تھا کہ مختلف محکموں کے ۲۰۰۷ گزیٹڈ افسروں میں عیسائی ۱۰۸۰، ہندو ۸۵۰ اور مسلمان صرف ۷۷ ہیں۔

دوسرے صوبوں سے متعلق اس عرضداشت میں یہ بیان کیا گیا تھا کہ شمال مغربی صوبوں کی حد تک مسلمان اور ہندو افسروں میں اگرچہ اتنا زیادہ فرق نہیں ہے، تاہم ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے بہت زیادہ ہے۔ مدراس میں مسلمان اور ہندو سرکاری ملازموں کا تناسب ۱ : ۱۰ ہے اور اس صوبہ کے اندرونی اضلاع میں تو یہ تناسب ۱ : ۳۲ تک گر گیا ہے۔

انگریزی کو ہندوستان کی سرکاری زبان بنانے، ملازمتوں کے بارے میں نئی پالیسی اختیار کرنے اور عطیات واپس لینے کی وجہ سے مسلمانوں پر جو بُرا اثر پڑا اس کو واضح کرنے کے لیے عرضداشت میں یہ کہا گیا تھا کہ جب انگریزی زبان کو سرکاری زبان قرار دیا گیا اور حصول ملازمت کے لیے یہ زبان جاننا لازمی ہو گیا تو حکومت کا یہ بھی فرض تھا کہ وہ مسلمانوں کے لیے انگریزی سیکھنے کے ذرائع و سہولتیں بھی فراہم کرتی۔ ۱۷۶۵ء کے معاہدہ کے مطابق مسلمانوں کو یہ حق حاصل تھا کہ ان کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا اور اگر زیادہ فراخ دلی سے کام لیا جاتا تو مسلمان ان مصائب سے محفوظ رہتے جن میں وہ مبتلا ہو گئے ہیں۔

انعامات واپس لینے کے نتائج

مسلمانوں کے عہدِ حکومت میں امرا اور منصبداروں کے علاوہ ایک طبقہ ان لوگوں کا بھی تھا جن کو لاخراج زمینیں عطا کی گئی تھیں۔ یہ زمینیں بادشاہ بھی دیتے تھے اور بڑے امرا بھی، اور ان پر لگان معاف ہوتا تھا جس کی وجہ سے یہ طبقہ بہت خوشحال تھا۔ یہ عطیات بڑے عالم و فاضل لوگوں کو اس مقصد سے دیئے جاتے تھے کہ ان کی آمدنی سے فلاحی اور تعمیری ادارے چلائے جائیں۔ چنانچہ اس ملک کے اکثر تعلیمی ادارے اسی قسم کے عطیات کی وجہ سے قائم تھے۔ اس مقصد کے لیے بادشاہ بھی زمینیں عطا کرتا تھا اور مخیر افراد بھی املاک وقف کرتے تھے۔ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعد مرکزی حکومت کمزور ہونے لگی اور دُور افتادہ صوبوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ چنانچہ مقامی امرا با اختیار ہو گئے اور لاخراج زمینیں انھوں نے بھی عطا کیں۔

جب ایسٹ انڈیا کمپنی کو سیاسی اقتدار حاصل ہوا تو اس نے بھی ان عطیات کو برقرار رکھا اور ۱۸۲۸ء تک اسی پالیسی پر کاربند رہی۔ اگرچہ کمپنی کا یہ نظریہ تھا کہ جو انعامات مغل بادشاہوں کے عطا کردہ نہیں ہیں ان پر خود اس کو پورا حق حاصل ہے تاہم اس نے ۱۸۲۸ء تک اس سلسلہ میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا۔ لیکن اس سال کمپنی کی حکومت نے انعامات واپس لینے کا فیصلہ کیا اور اٹھارہ سال تک اس پر بہت سختی سے عمل کرتی رہی۔

ہندوستان بھر میں امرا اور خود اختیار حکمرانوں کے ان عطیات سے کئی صدیوں سے استفادہ کیا جا رہا تھا اور ان کو واپس لینے کے فیصلے کا نتیجہ یہ نکلا کہ سینکڑوں قدیم خاندان تباہ و برباد ہو گئے اور مسلمانوں کے بے شمار تعلیمی ادارے جو ان انعامات سے چلائے جا رہے تھے بند ہونے لگے۔ اس طرح اہلِ علم اور علمی ادارے ۱۸ سال کے اندر تباہ ہو گئے۔ اگرچہ انعامات واپس لینے کا یہ سلسلہ ۱۸۴۶ء میں ختم ہو گیا لیکن اس کی وجہ سے اتنا زبردست نقصان پہنچ چکا تھا کہ مسلمان پھر سنبھل نہ سکے اور روز بروز ان کی حالت بگڑتی ہی گئی۔

مذکورہ بالا حالات کو مدنظر رکھ کر غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کی مفلوک الحالی اور پستی کا سبب یہ نہیں کہ انھوں نے انگریزی زبان سیکھنے سے غفلت برتی۔ شروع میں ان کا رویہ خواہ کچھ ہی رہا ہو لیکن گذشتہ پچیس سال سے تو مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر پوری توجہ کر رہے ہیں۔ ان کی پستی کا اصل سبب ان کا عام افلاس ہے۔ ایک خوش حال درمیانی طبقے کو ہر قوم میں ریڑھ کی ہڈی جیسی اہمیت حاصل ہوتی ہے اور مسلمانوں کا یہی طبقہ بالکل تباہ و برباد ہو گیا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ مسلمان والدین اپنے لڑکوں کو ایسی تعلیم دینے کی سکت نہیں رکھتے جو زندگی کے مختلف شعبوں میں یورپیوں اور ہندوؤں سے مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اگرچہ بنگال کے موجودہ لفٹنٹ گورنر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے گہری دلچسپی لے رہے ہیں اور مسلمان طلباء کے لیے کچھ وظیفے اور اسکول کی فیس دینے کا انتظام کر دیا ہے لیکن یہ امداد انتہائی ناکافی اور محض برائے نام ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہندو افسروں کا رویہ

ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ حکومت سے امداد کے لیے ہماری اپیل پر مخالفانہ تنقید بھی کی جائے گی اور اسے قومی کردار کی کمزوری سے موسوم کیا جائے گا اور یہ بھی کہا جائے گا کہ سرکاری ملازمتوں کو قومی خوش حالی کا ذریعہ سمجھنا بڑی غلطی ہے لیکن کیا کیا جائے حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ مسلمانوں کے پاس سرمایہ نہیں ہے اور یہ ان کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے کیونکہ سرمایہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ نہ تو کوئی صنعت قائم کر سکتے ہیں اور نہ تجارت میں حصہ لے سکتے ہیں۔

موجودہ حالات میں مسلمان یہ محسوس کرتے ہیں کہ شدید مشکلات کی وجہ سے وہ اپنی مالی حالت درست نہیں کر پاتے۔ گذشتہ بیس سال سے وہ پوری محنت اور کوشش کر رہے ہیں کہ ملازمتوں میں ہندوؤں کے دوش بدوش اپنا حصہ حاصل کریں لیکن بدقسمتی سے با اختیار ہندوؤں نے ان کے لیے ملازمت کے تمام دروازے بند کر رکھے ہیں اور یہ تقریباً ناممکن ہو گیا ہے کہ کسی سرکاری دفتر میں کوئی مسلمان سرکاری ملازمت حاصل کر سکے۔ ہمارا مقصد ہندوؤں کی مذمت کرنا نہیں بلکہ ان حقایق کو ظاہر کر دینا ہے جن کی وجہ سے حکومت کی خواہش کے مطابق بھی عمل نہیں ہو سکتا۔ مسلمانوں کے خلاف حسد کا نتیجہ سازشوں کی شکل میں نکلتا ہے اور جو لوگ مختلف دفتروں میں با اختیار عہدوں پر پہلے سے قابض ہیں ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جائز اور ناجائز ہر قسم کے حربے اختیار کر کے مسلمانوں کو ملازمت سے محروم رکھا جائے۔ چنانچہ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جب کسی دفتر میں کوئی جگہ خالی ہوتی ہے تو مسلمان امیدوار کا مسئلہ افسر اعلیٰ تک پہنچنے ہی نہیں پاتا اور اگر خوش قسمتی سے کسی دفتر میں کوئی مسلمان ملازم ہو جاتا ہے تو سازشیں کر کے اسے نکلوا دیا جاتا ہے۔

غیر مسلم جج اور اسلامی قانون

مسلمانوں کو ایک اور بڑی شکایت ہے جو عدلیہ سے متعلق ہے۔ انگریز اور ہندو جج اسلامی قانون سے عموماً ناواقف ہوتے ہیں اور اس کی وجہ سے جو بے انصافیاں ہوتی ہیں وہ مسلمانوں کے ہر طبقہ کے لیے مایوسی اور بے اطمینانی کا باعث بن گئی ہیں۔ مفتی اور قاضی القضاۃ ایسے عہدہ دار تھے جو اسلامی شریعت کے مطابق فیصلہ کرنے میں یورپین ججوں کی امداد کرتے تھے اور جب سے یہ عہدے ختم کر دیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

گئے ہیں اسلامی قانون پر عمل درآمد ہی بند ہو گیا ہے اور خاندانی امور سے متعلق اسلامی قوانین کے بڑے حصے کو تو ہندوستانی عدالتیں تسلیم ہی نہیں کرتیں۔

چند مطالبات

اس زمانے میں مسلمان جن مصائب و مشکلات میں مبتلا تھے اور حکومت سے ان کو جو شکایات تھیں ان کو دُور کرنے کے لیے وائسرائے کو یہ عرضداشت پیش کی گئی تھی۔ اور اس میں کچھ ایسے مطالبات بھی کیے گئے جو مسلمانوں کے نزدیک بہت اہم تھے اور جن کو پورا کر کے حالات بہتر بنائے جا سکتے تھے۔

مسلمانوں کو مساوی مواقع دیے جائیں

پہلا مطالبہ یہ کیا گیا کہ حکومت ہندوؤں اور مسلمانوں کی سرپرستی مساوی طور پر کرے اور اس کی پالیسی متوازن ہو۔ اگرچہ حکومت ہند اور مقامی حکومتیں مختلف محکموں کے اعلیٰ افسروں کے نام وقتاً فوقتاً یہ ہدایات جاری کرتی رہی ہیں کہ مسلمانوں کے حقوق کا مناسب لحاظ رکھا جاتے۔ لیکن عملاً اس سے مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا ہے۔ اور اس کے دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ حکومت کے اعلیٰ ترین عہدہ داروں میں مسلمانوں سے انصاف کرنے کا جو جذبہ ہے وہ ان سب عہدہ داروں میں نہیں پایا جاتا جن کا یہ فرض ہے کہ مسلمانوں کو ان کا حق دیں اور دوسرے یہ کہ یونیورسٹی کی تعلیم کو غیر ضروری اہمیت دی جاتی ہے۔ چنانچہ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ دو امیدواروں میں سے جب ایک ہندو اور دوسرا مسلمان ہوتا ہے تو ہندو کو ترجیح دی جاتی ہے۔ اس بنا پر کہ اس کے پاس یونیورسٹی کی سند ہوتی ہے خواہ عام تعلیم کے اعتبار سے مسلمان اس سے کتنا ہی زیادہ قابل کیوں نہ ہو۔ دراصل اب تک حکومت کی پالیسی کچھ ایسی رہی کہ مسلمانوں میں یونیورسٹی کی تعلیم زیادہ نہ پھیل سکی اور اس جانب انھوں نے حال ہی میں توجہ کی ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمان گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ کم ہوتے ہیں لیکن یونیورسٹی گریجویٹ نہ ہونے کے باوجود بہت سے مسلمان ایک معمولی گریجویٹ سے زیادہ انگریزی جانتے ہیں اس لیے یہ مناسب ہوگا کہ ملازمت کے لیے یونیورسٹی کی سند کو غیر ضروری اہمیت نہ دی جائے اور امیدوار کی قابلیت کے لیے ایک موزوں معیار مقرر کیا جائے۔ صلاحیت کار اور کردار کی اہمیت سے انکار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کیا جاسکتا اور یہ وہ خوبیاں ہیں جن کا معیار محض یونیورسٹی کی سند نہیں ہوسکتی۔

نقصان رساں شرائط ختم کی جائیں

ماتحت عدالتوں میں مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم ہے اور اس کا سبب وہ شرائط ہیں جو اعلیٰ درجہ کی وکالت اور منصفی کے امتحان کے لیے ۱۸۶۵ء میں عائد کی گئی تھیں منصفی پر تقرر کے لیے کلکتہ یونیورسٹی کا بی۔ ایل ہونے کی شرط رکھی گئی ہے جو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ بہت سے لوگ جو عدالتی عہدوں پر تقرر کے لیے ہر طرح سے موزوں ہوتے ہیں محض یونیورسٹی کی ڈگری نہ ہونے کی وجہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ ماتحت انتظامی سروس کی طرح ماتحت عدالتی سروس میں بھی یہ اصول اختیار کرلینا چاہیے کہ جس شخص میں اس عہدہ پر تقرر کے لیے ضروری قابلیت موجود ہو اس کا تقرر کر دیا جائے اور اس کے لیے بی۔ اے یل ہونا لازمی نہ ہو۔

مسلم اوقاف کی آمدنی تعلیم پر صرف کی جائے

حال ہی میں یوریشیوں کی تعلیم کے لیے ایک جامع اسکیم مرتب کی گئی ہے۔ اسی قسم کی ایک مناسب اسکیم مسلمانوں کی تعلیم کے لیے بھی بنائی جائے۔ عام طور سے مسلمان بہت غریب ہوگئے ہیں اور ان کے تعلیمی عطیات کی ضبطی اور خیراتی اوقاف کی بربادی کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ وہ تعلیم میں بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ مسلمان والدین کی حالت ایسی نہیں رہی کہ وہ اپنی اولاد کو اچھی تعلیم دے سکیں اور بہت سے طلبا اپنے خاندان کے حالات سے مجبور ہو کر روزی کمانے کے لیے تعلیم ترک کر دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ حکومت مسلمانوں کی تعلیم کے لیے خصوصی انتظام کرے اور ان کو بھی اسی طرح کی سہولتیں دی جائیں جو یوریشیوں کو دی جاتی ہیں۔ مسلم اوقاف کی کثیر رقمیں اب بھی حکومت کی تحویل میں ہیں اور مسلمان اس کے حقدار ہیں کہ یہ رقمیں حکومت ان کی تعلیم پر نہایت احتیاط کے ساتھ صرف کرے۔ سارے ملک میں ایسی املاک موجود ہیں جو مذہبی اور تعلیمی اغراض کے لیے وقف کی گئی ہیں اور اس بات کا خیال رکھنا لازمی ہے کہ ان کی آمدنی ضائع نہ ہو بلکہ وقف کرنے والوں کی ہدایت اور منشا کے مطابق صرف کی جائے۔

انگریزی سرکاری زبان ہوگئی تھی اور اس زبان کو سیکھنا اور اس کے ذریعہ مغربی علوم و فنون حاصل کرنا بہت ضروری تھا۔ چنانچہ عرضداشت میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ ایک کمیشن مقرر کیا جائے جس میں محکمہ تعلیم کے ڈائرکٹر، دو ایک یورپین افسر چند دانشور اور کچھ روشن خیال و اصلاح پسند مسلمان شامل کیے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائیں۔ یہ کمیشن مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے مسئلہ پر اچھی طرح غور کر کے ایک اسکیم تیار کرے اور اس پر عمل کیا جائے اس تجویز کو کامیاب بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مسلم اوقاف کو محفوظ رکھا اور تعلیمی اغراض کے لیے استعمال کیا جائے۔

فارسی رسم الخط کے خلاف حکم واپس لیا جائے

بہار کے باشندوں نے حکومتِ بنگال کو ایک معروضہ پیش کر کے یہ استدعا کی ہے کہ عدالتوں میں فارسی کی جگہ ناگری رسم الخط استعمال کرنے کا حکم واپس لے لیا جائے۔ بہار کے ہندوؤں کی اکثریت مسلمانوں کی تہذیب سے متاثر ہے اور یہ لوگ خالص اُردو بولتے اور اس پر فخر کرتے ہیں۔ اردو صدیوں سے اس صوبے کی زبان بنی ہوئی ہے۔ سب ہی لوگ اس کو بولتے اور سمجھتے ہیں اور رسم الخط کی یہ تبدیلی تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے بہت تکلیف دہ ہے۔ اس سے کوئی بھی مطمئن نہیں ہے اور اس خط میں قانونی عبارت لکھنے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ امید ہے کہ تمام امور کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہ حکم منسوخ کر دیا جائے گا۔

اسلامی شریعت سے واقف جج مقرر کیے جائیں

اسلامی قانون کے مطابق فیصلے کرنے کے لیے عرضداشت میں یہ تجویز پیش کی گئی کہ مفصلات کی عدالتوں میں اسلامی شریعت سے بخوبی واقف جج مقرر کیے جائیں جو مسلمانوں کے مقدمات میں اسیسر ججوں کے فرائض انجام دیں۔ کلکتہ، شمال مغربی صوبوں، مدراس اور بمبئی کے ہائی کورٹوں اور لاہور کے چیف کورٹ میں مسلمان جج مقرر کیے جائیں جو مسلم قانون کے مطابق فیصلے کرنے میں یورپی اور ہندو ججوں کی مدد کریں۔ مسلمانوں کو اس بات کا رنج ہے کہ ہائی کورٹوں میں مسلمان جج مقرر نہیں کیے جاتے حالانکہ مدراس، بمبئی اور کلکتہ کے ہائی کورٹوں میں کئی ہندو جج موجود ہیں۔

عرضداشت کے آخر میں یہ واضح کر دیا گیا کہ اس میں مسلمانوں کا نقطۂ نظر پورے خلوص اور دیانت کے ساتھ پیش کر دیا گیا ہے تاکہ ان کی شکایات واضح ہو جائیں اور انھیں دُور کرنے کی مناسب تدابیر اختیار کی جا سکیں۔ اس سے اہلِ ملک کی فلاح و بہبود کے مقصد کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی اور مسلمان قوم کو موجودہ حالات سے نجات ملے گی جو نہ صرف اس کے لیے تباہ کن ہیں بلکہ خود سلطنت کے مفاد کے لیے بھی نقصان رساں ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ عرضداشت امیر علی نے تیار کی تھی اور اس میں جو باتیں کہی گئی تھیں ان سے اہلِ انگلستان کو باخبر کرنے اور مسلمانوں کے مسائل و مطالبات پر اس ملک کے با اثر اور با اقتدار حلقوں کی توجہ منعطف کرانے کے لیے امیر علی نے ایک مضمون A cry from the Indian Mahommedans لکھا جو اگست ۱۸۸۲ء میں Nineteenth Century میں شائع ہوا اور اس میں مسلمانوں کے مسائل کو بہت تفصیل سے واضح کیا گیا تھا۔

وائسرائے کی تجویز

اس عرضداشت پر حکومت نے پوری طرح غور کیا اور ۱۷ جولائی ۱۸۸۵ء کو حکومت ہند نے ایک امید افزا قرارداد منظور کی۔

سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو معقول حصہ دینا ایک ایسا مسئلہ تھا جس پر عرضداشت میں خاص طور پر زور دیا گیا تھا اور اس کے متعلق وائسرائے نے یہ تحریر کیا کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل کی یہ خواہش ہے کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں پورا حصہ نہیں ملتا وہاں ملازمت کے مواقع نکلنے پر مقامی حکومتیں اور ہائی کورٹ اس تفاوت کو دور کرنے کے لیے پوری کوشش کریں اور اپنے ماتحت افسروں پر یہ واضح کر دیں کہ ملازمتوں پر تقرر کے لیے امیدواروں کا انتخاب کرتے وقت اس اصول کو ملحوظ رکھنا کس قدر اہم ہے۔ صوبائی حکومتوں کی سالانہ رپورٹوں میں یہ دیکھ لینا سودمند ہوگا کہ سرکاری دفاتر میں مسلمان ملازم کتنے ہیں۔

لارڈ ڈفرن کا جواب

مارچ ۱۸۸۸ء میں اسوسی ایشن نے بنگال کے لفٹننٹ گورنر کو بھی ایک عرضداشت پیش کی جس میں سرکاری ملازمتوں پر تقرر کرنے کے طریقے پر احتجاج کرتے ہوئے یہ واضح کیا گیا تھا کہ امیدواروں کی صلاحیت اور قابلیت کا اندازہ کرنے کے لیے مقابلہ کے امتحانات کا طریقہ شدید مغالطے میں ڈال دیتا ہے اور جہاں تک کہ مسلمانوں کا تعلق ہے امیدواروں کی آزمائش کا یہ طریقہ غیر یقینی اور افسوسناک ہے۔

۱۲ نومبر ۱۸۸۷ء کو اسوسی ایشن کی سندھ برانچ کی طرف سے ایک وفد جس کے قائد حسن علی تھے وائسرائے ہند لارڈ ڈفرن سے کراچی میں ملا اور ان کو مسلمانوں کی زبوں حالی پر توجہ دلائی۔ وائسرائے نے وفد کے معروضات کا حوصلہ افزا جواب دیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مارچ ۱۸۸۸ء میں لارڈ ڈفرن جب ہندوستان سے رخصت ہونے لگے تو مرکزی اسوسی ایشن کا ایک وفد ان سے کلکتہ میں ملا اور امیر علی نے سپاسنامہ پیش کیا جس میں یہ توقع ظاہر کی گئی تھی کہ برطانوی حکومتِ ہندوستانی مسلمانوں کے جائز مطالبات کی حمایت کرے گی۔

اس سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے وائسرائے نے کہا کہ انگریزی حکومت کا رہنما اصول ہمیشہ یہ رہا ہے کہ کاروبارِ سلطنت انتہائی غیر جانبداری سے انجام دیا جائے کیونکہ برطانوی شہنشاہیت میں مختلف مذاہب اور اقوام کے لوگ شامل ہیں اور اس کام کو مؤثر طور پر انجام دینے کے لیے اس بات کو ملحوظ رکھنا حکومت کا فرض ہے کہ ہر ایک قوم کو معقول مواقع حاصل ہوں اور جن حالات میں وہ زندگی کی جدوجہد کا آغاز کریں وہ ان سب کے لیے یکساں اور سازگار بنا دیئے جائیں۔ چنانچہ مسلمانانِ ہند کو بھی یہ یقین رکھنا چاہیئے کہ ان کی جدوجہد میں جو مزاحمتیں ہوں گی، بالخصوص ایسی مزاحمتیں جو ان کے مذہبی احکام سے ایماندارانہ وابستگی کا نتیجہ ہوں، ان کو دور کرنے کے لیے وہ جو کوششیں کریں گے ان کو حکومت ہمیشہ انتہائی ہمدردی اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گی۔

انڈین نیشنل کانگرس سے اختلاف

۱۸۸۵ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس قائم ہوئی تو نیشنل محمڈن اسوسی ایشن نے کسی قسم کی گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا اور اس کے تاسیسی اجلاس میں بہت بے دلی کے ساتھ حصہ لیا لیکن اس کے بعد ہی اس سے بالکل بے تعلق ہو گئی کیونکہ وہ کانگرس کے چند بنیادی مقاصد اور اس سے مسلمانوں کے تعلق کو مسلم قوم کے مفاد کے خلاف تصور کرتی تھی۔ ۱۸۸۶ء میں جب کہ کانگرس کو قائم ہوئے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا، اسوسی ایشن نے اس سے بے تعلق رہنے کا فیصلہ کیا۔ اور اپنے اس فیصلے کے اسباب یہ بتلائے کہ انڈین نیشنل کانگرس نے اپنا جو پروگرام بنایا ہے اگر اس کو غیر مشروط طور پر قبول کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ مسلمان سیاسی اعتبار سے ختم ہو جائیں گے۔ اسوسی ایشن یہ تسلیم کرتی ہے کہ حکومت نے نامزدگی کا جو اصول اختیار کیا ہے اس کے نتائج ہمیشہ خاطر خواہ نہیں ہوتے۔ لیکن ہندوستان میں مسلمانوں کی جو حالت ہے اس کے پیش نظر اسوسی ایشن یہ کبھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ اگر اس ملک میں نمائندہ اداروں کا نظام بغیر کسی ترمیم کے اپنی اصلی شکل میں نافذ کر دیا جائے تو اس سے مسلمانوں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقصان نہیں پہنچے گا۔ نمائندگی کے اصول پر غور کرتے وقت اقلیت کے حقوق کو ملحوظ رکھنا لازمی ہے۔ اسوسی ایشن کوئی ایسا نظام قائم کرنے سے بھی اتفاق نہیں کرسکتی۔ جس کی وجہ سے اقلیت حکومت کے ہر شعبہ میں اکثریت میں بالکل گم ہوجائے۔

علاوہ ازیں اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ہندو اور مسلمان دو قوموں میں سیاسی بیداری یکساں نہیں ہے اور مسلمانوں نے انگریزی تعلیم حاصل کرنے پر حال ہی میں توجہ کی ہے۔ اسلئے اسوسی ایشن کا یہ اہم فرض ہے کہ وہ ہر اس تحریک سے ہوشیار رہے جس سے مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو۔ جو مسلمان کانگرس کے مقاصد و نظریات کی آنکھ بند کرکے تائید کرتے ہیں ان کی نادانی پر اسوسی ایشن اظہار افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اسوسی ایشن کو یقین ہے کہ جب تک مسلمان سیاسی بیداری اور تعلیمی ترقی میں ہندوؤں کے برابر نہ ہوجائیں گے اور مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کو بھی کانگرس اپنے پروگرام میں شامل نہیں کرلے گی اس وقت تک کانگرسیوں کی آرزوؤں کی تکمیل کے معنی یہ ہوں گے کہ اس ملک میں مسلمان ایک قوم کی حیثیت سے بالکل مٹ جائیں گے۔"

امیر علی اور کانگریس

کانگریس کے بارے میں اسوسی ایشن کا یہ نظریہ بہت دوراندیشی اور غور و فکر کا نتیجہ تھا اور یہ ہندوؤں سے عداوت پر نہیں بلکہ مسلمانوں کے قومی مفاد کی حفاظت پر مبنی تھا۔ امیر علی اور ان کے ہم خیال رہنماؤں نے کانگریس کی ابتدا ہی میں جن خطرات کو محسوس کرلیا تھا وہ درست ثابت ہوئے۔

یہ پالیسی درحقیقت امیر علی کی دور بینی و دوراندیشی کا نتیجہ تھی۔ کانگریس کے بانی رہنماؤں سے امیر علی کے اچھے مراسم تھے اور وہ ذاتی طور پر ان کا احترام بھی کرتے تھے لیکن سیاسی مقاصد میں شدید اختلاف رکھتے تھے، کیونکہ یہ لوگ مغرب کے جن اداروں اور نظریات کو ہندوستان میں نافذ کرنا چاہتے تھے وہ یہاں کے مخصوص حالات کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے تباہ کن تھے۔ یہی سبب ہے کہ امیر علی نے کانگرس تحریک کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے سے روکا۔ کانگریس کے انگریز بانی ڈیوڈ ہیوم امیر علی کے دوست تھے اور جب کانگریس قائم ہوئی تو امیر علی ہندوستان کے سیاسی اور حکومتی حلقوں میں امتیازی مرتبے کے مالک تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۵ء میں بنگال ٹننسی ایکٹ کی منظوری کے سلسلہ میں جب وہ شملہ گئے تو ڈیوڈ ہیوم ان سے ملے اور یہ خواہش کی کہ وہ کانگریس کے صدر بن جائیں لیکن امیر علی نے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انکار کر دیا۔ کانگرس کے متعلق ان کا جو نظریہ تھا وہ اس پر ہمیشہ قائم رہے۔ چنانچہ اس زمانے میں بھی جب کہ کانگریس اور مسلم لیگ میں قریبی ربط پیدا ہو گیا تھا اور مسلم لیگ کے رہنما کانگریس کے بھی رہنما تھے امیر علی نے اپنی پالیسی نہیں بدلی۔ یہی سبب ہے کہ جب ۱۹۱۲ء میں مسٹر محمد علی جناح نے جو اس وقت کانگریس کے ممتاز رہنما تھے اور مسلمانوں کے قائد اعظم نہیں بنے تھے، امیر علی سے کانگریس کا صدر بننے کے لیے کہا تو انھوں نے یہ پیش کش قبول کرنے سے پھر انکار کر دیا۔

مرکزی کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز

امیر علی سب سے پہلے مسلمان لیڈر تھے جنھوں نے کانگریس کے پروگرام اور نظریات سے اختلاف کیا۔ متحدہ ہندوستانی قومیت کے تصور پر مبنی کانگریسی تحریک کی مخالفت کی۔ مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہونے سے روکا اور یہ واضح کیا کہ نیشنل کانگریس جن اصول و مطالبات کے لیے جد و جہد کر رہی ہے وہ مسلمان قوم کے لیے تباہ کن ہوں گے۔ حکومت اور کانگریس دونوں اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ ہندو اور مسلمان دونوں ایک ہی قوم کے دو فرقے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے مسلمان اقلیت نہیں ایک الگ قوم ہیں اور ملک کی فلاح و بہبود کے لیے یہ لازمی ہے کہ مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے سیاسی و معاشی حقوق دیئے جائیں اور ان کے مفادات کا تحفظ کیا جائے۔ چنانچہ ۱۸۸۷ء میں امیر علی نے یہ تجویز کیا تھا کہ ہندوستان کے مختلف صوبوں میں نیشنل محمڈن اسوسی ایشن کی جو شاخیں قائم ہیں وہ ایک مرکزی کانفرنس منعقد کر کے باقاعدہ یہ اعلان کریں کہ مسلمان ایک جداگانہ قوم ہیں اور حکومت جداگانہ قوم کی حیثیت سے ان کے سیاسی و اقتصادی حقوق تسلیم کرے۔

۱۸۷۷ سے ۱۹۰۴ء تک امیر علی نیشنل محمڈن اسوسی ایشن کی رہنمائی کرتے رہے اور یہ جماعت مسلمانوں کے سیاسی و معاشی حقوق و مفادات کے حصول اور تحفظ کے لیے سرگرم عمل رہی۔ ۱۹۰۴ء میں امیر علی انگلستان چلے گئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ ہندوستان میں کوئی شخص ان کی جگہ نہ لے سکا۔ اسوسی ایشن کی سرگرمیاں موقوف ہو گئیں اور رفتہ رفتہ یہ تنظیم ختم ہو گئی لیکن مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا۔ وہ سیاسی تنظیم کی ضرورت و اہمیت سے واقف ہو چکے تھے اور تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات میں سیاسی تنظیم کو لازمی تصور کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے اپنی تنظیم کرنے پر فوراً ہی متوجہ ہوئے اور ۱۹۰۶ء میں کل ہند مسلم لیگ قائم ہو گئی۔

© rasailojaraid.com